ھماری کتابیں.....

خُوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

صفدر حسین

ضابطہ:۔

اشاعت دوم : 2012ء

مطبع : حاجی حنیف پرنٹرز لاہور

سرورق : ریاظ

قیمت : 600روپے

شاخِ تنہا

شاخِ تنہا

خورشید رضوی

مجید امجد کے نام

اپنے جی میں جی، مگر اُس یاد سے غافل نہ جی
جو کسی کے دل میں زندہ ہے ترے دل کے لئے

مجید امجد

شعر کی دھن مرے سینے میں بسائی ہے تو پھر
خون کو شعر کی رگ میں اتر آنا بھی سکھا

کب تلک، شمع صفت، بزم میں تنہا روؤں
خالقِ گریہ! اب اوروں کو رلانا بھی سکھا

ترتیب

پیش لفظ

شاعری کا ایک معمولی سا طالب علم بھی رومانی اور کلاسیکی مکاتبِ شعر کے فرق کو بخوبی سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کلاسیکی مکتبِ شعر سے منسلک شاعر کے ہاں روایت سے تعلق خاطر قوی اور قواعد وضوابط کا احترام ایک مسلک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے اخلاقی جمالیاتی اور سیاسی عقائد کو تسلیم کرتا ہے اور شعری محاورے، تلمیح اور زبان کے رائج اور قابلِ فہم استعمال پر جان نچھاور کرتا ہے۔ بعد ازاں جب وہ معاشرے اور اس کی روایات کا پوری طرح تابعِ مہمل بن جاتا ہے تو اس کے کلام سے "انفرادیت" کی آخری رمق بھی خارج ہو جاتی ہے۔ اس سے شاعر کو یہ فائدہ تو ضرور پہنچتا ہے کہ سامعین بالخصوص مشاعرے کے سامعین اس کے کلام کو اپنا کلام سمجھ کر محظوظ ہونے لگتے ہیں۔ مگر نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں اس کا کلام اس کا اپنا کلام نہیں رہتا بلکہ ہر کسی کی ملکیت قرار پاتا ہے۔ دوسری طرف رومانی مکتبِ شعر سے منسلک شاعر کے ہاں شکست وریخت آزادی اور آزادہ روی کا میلان زیادہ قوی ہوتا ہے۔ وہ انبوہ میں رہتا تو ہے مگر اس میں رہتے ہوئے خود کو سدا اکیلا محسوس کرتا ہے۔ کلاسیکی شاعر سوسائٹی کی پیداوار ہی نہیں اس کا علمبردار بھی ہے جب کہ رومانی شاعر اپنی ہی ذات کی تعمیر تنہائی اور بے قراری کا سمبل ہے۔ شعری زبان کے سلسلے میں بھی وہ روایت سے روگردانی کرتے ہوئے ایک اپنی زبان خلق کرتا ہے۔ وہ پٹی ہوئی اور پامال قدروں سے منحرف ہو کر اپنے لئے ایک ایسا جہانِ تازہ وجود میں لاتا ہے جسے پرانی نسل مشکل ہی سے قبول کرتی ہے۔ مگر الیہ ملاحظہ کیجئے کہ رومانی شاعر جب اپنے مکان کو گراتا ہے تو خود اس کے ملبے کے نیچے دب جاتا ہے اور کلاسیکی شاعر جب اپنے مکان پر آرائشی سامان لاد کر اس کی کھڑکیاں اور

دروازے بند کر دیتا ہے تو اس میں قید ہو کر رہ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں شاعری دم رکنے کی کیفیت میں مبتلا ہوتی ہے اور کبھی کبھی وجود میں آنے سے پہلے ہی راہیٔ ملکِ عدم ہو جاتی ہے۔ شاعر چاہے رومانی اندازِ فکر کا حامل ہو چاہے کلاسیکی رویے کا' اس کے ہاں عمدہ شاعری انہیں لمحات میں وارد ہوتی ہے جب وہ ان دونوں کے نقطۂ انضمام پر لحظہ بھر کے لئے آ کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی جب اس کے ہاں معاشرتی قدروں کے احترام کے ساتھ ساتھ خول سے باہر آنے کی روش بھی وجود میں آتی ہے شاید اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ رومانیت مغز کی طرح ہے اور کلاسیکیت اس چھلکے کی طرح ہے جو اس مغز کو اپنی آغوش میں لئے ہوتا ہے۔ مگر جب تخلیق کا لمحہ آتا ہے تو مغز چھلکے کو توڑ کر باہر کو لپکتا ہے اور تشکیلِ ذات کا پیچیدہ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ چھلکے کے بغیر مغز کیلئے خود کو محفوظ رکھنا مشکل تھا اور مغز کے بغیر چھلکے کا قائم رہنا بے معنی۔ خورشید رضوی کے زیرِ نظر شعری مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ اس کے ہاں رومانی اور کلاسیکی دونوں رویوں نے قدم قدم پر ایک دوسرے سے مصافحہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ہاں ایسا شعری مواد وجود میں آیا ہے جو کلاسیکی رکھ رکھاؤ سے عبارت بھی ہے اور رومانی لپک کا حامل بھی۔

ہر چند اردو کی کلاسیکی غزل اپنے ماحول سے پوری طرح جڑی ہوئی تھی لہٰذا اس نے اپنے شعری مواد کو معاشرے کے تمام ابعاد سے حاصل کیا ہے تاہم اس میں تلازمات کے پانچ سلسلے بہت نمایاں ہوئے۔ ان میں سے ایک سلسلہ چمن کے تلازمات پر مشتمل تھا اور گل و بلبل' دانہ و دام' صیاد' قفس' صبا اور بہار و خزاں کی زبان میں محبت کی داستان کو پیش کرتا تھا۔ دوسرا سلسلہ صحرا کے تلازمات سے عبارت تھا اور قیس و لیلیٰ' ناقہ' آہو وغیرہ الفاظ میں عشق کی واردات کو بیان کرتا تھا۔ تیسرا سلسلہ سمندر یا دریا کے تلازمات کا حامل تھا اور قطرہ' موج' ساحل' نہنگ' کشتی اور بادِ شرطہ کی زبان میں تصوف کے مدارج کا احاطہ کرتا تھا۔ چوتھا سلسلہ دربار یا بزمِ طرب سے اخذ کردہ تلازمات پر مشتمل تھا اور مے و مینا' شمع و پروانہ' رقیب' نامہ بر' فراق اور وصال کے کوائف کو پیش کرتا تھا اور پانچواں سلسلہ آلاتِ حرب سے متعلق تھا اور تیر' سناں' تلوار' ڈھال' زخم اور پھر اس ساری کارروائی کے نتیجے میں قتل' موت اور قبر کی باتیں کر کے معاشرے

کے جارحانہ رویوں کی عکاسی کرتا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ اور سلسلے بھی تھے مگر میں یہاں اہم ترین سلسلوں کے ذکر پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ نئی اردو غزل جب اپنے رومانی طوفانوں کے زیر اثر آگے بڑھی تو اس نے اپنی پہلی ہی یلغار میں کلاسیکی غزل کے ان جملہ سلسلوں سے ایک بڑی حد تک منہ موڑ لیا اور یوں ایک ایسی فضا میں آ گئی جو تھی تو نئی اور تازہ مگر جو بہت سے نئے غزل گو شعراء کو راس نہ آئی۔ اس لئے کہ انہوں نے روایت سے خود کو غیر ضروری طور پر منقطع کر لیا تھا۔

خورشید رضوی کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ ہر چند وہ اپنے ردِ عمل کی نوعیت کے اعتبار سے نئی غزل کے علمبرداروں میں شامل ہے۔ تاہم اس نے کلاسیکی غزل کے سلسلوں سے منحرف ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان سے وابستہ تلازمات کو بڑی خوبی سے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ شاعری میں سب سے مشکل کام یہی ہے کہ نئی شراب کو پرانے آبگینوں میں پیش تو کیا جائے مگر اس طور کہ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھل کر کچھ سے کچھ ہو جائے۔ بلکہ یوں محسوس ہو جیسے آج سے پہلے اس آبگینے کو استعمال میں لایا ہی نہیں گیا تھا۔

خورشید رضوی کے زیرِ نظر مجموعے میں کلاسیکیت اور رومانیت کا سنجوگ دکھائی دیتا ہے۔ وہ لفظ کو تراشنے اور سنوارنے کا گر جانتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے اشعار نگینوں کی طرح لو دیتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر صناعی کے عمل کے ساتھ ساتھ اس نے زاویۂ نگاہ کی تازگی کو بھی ہر جگہ برقرار رکھا ہے اور پٹی ہوئی اور پامال شعری فضا سے باہر آنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ چند اشعار دیکھئے جو خورشید رضوی کی انفرادیت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہیں:

آنکھ میچو گے تو کانوں سے گزر آئے گا حسن
سیل کو دیوار و در سے واسطہ کوئی نہیں

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستا نہیں

سب کے سب اپنے گریبانوں میں ہیں ڈوبے ہوئے
گل سے گل تک رشتۂ موجِ صبا کوئی نہیں

لبوں پہ آج سرِ بزم آ گئی تھی بات
مگر وہ تیری نگاہوں کی التجا کہ ''نہیں''

حیات و مرگ و طلوع و غروب ہے دنیا
کہ پہ سمٹتا ہے کوئی، ٹوٹتا ہے کوئی

مجھے یقین ہے کہ اہلِ نظر خورشید رضوی کے اس اوّلین مجموعۂ کلام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ خورشید رضوی کا شعری سفر اسی رفتار سے جاری رہے گا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مضامینِ نو کے انبار لگاتا چلا جائے گا۔ رہا خرمن کے خوشہ چینیوں کا قصہ، تو اس سلسلے میں قحط الرجال کا۔ فی الحال اسے کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہیے۔

وزیر آغا

سخن ہائے گفتنی

اس کتاب کا انتساب جناب مجید امجد کے نام ان کی زندگی میں کیا گیا تھا۔ بڑی آرزو تھی کہ وہ اسے اپنی آنکھ سے دیکھتے۔ لیکن بسا اوقات غیور لوگوں کی تقدیریں بھی غیور ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس سے قبل کہ حکومت کی طرف سے مقرر کردہ وظیفے کی پہلی قسط انہیں وصول ہوتی' یا ایک عقیدت مند کی طرف سے معنون کی گئی کتاب ان کی نظر سے گزرتی' وہ اسی بے آہٹ خاموشی کے ساتھ رخصت ہو گئے جس بے آہٹ خاموشی کے ساتھ انہوں نے زندگی بسر کی تھی۔ عجیب المناک اتفاق ہے کہ جس روز اس انتساب کی کتابت ہو رہی تھی' (11 مئی 1974) عین اسی روز مجید امجد نے ان تمام یادوں سے غفلت اختیار کر لی جو دوسروں کے دلوں میں ان کے دل کیلئے زندہ و موجود تھیں امید ہے کہ یہ یادیں آئندہ بھی زندہ و موجود رہیں گی۔

رہی یہ کتاب' سو اس کی اشاعت کا مجھے ایک شوقِ فضول تھا تو سہی' مگر جرأتِ رندانہ کی حد تک کبھی نہ تھا۔ اور اگر مکرمی چودھری عبدالحمید صاحب اور محبی فاروق اختر نجیب صاحب کی طویل مسلسل پر خلوص اور پر اصرار تحریک نہ ہوتی تو شاید یہ سامان بعد مرنے کے ہی میرے گھر سے نکل سکتا۔ لہٰذا اگر اس مجموعے کے اشاعت میں خوبی کا کوئی پہلو نکلتا ہے تو اس پر تہنیت کے مستحق یہی دونوں حضرات ہیں۔ ان کے علاوہ محمد یٰسین' جمیل اختر' خالد محمود تبسم' عبدالروف' انور سدید' سجاد نقوی' جمیل یوسف' خالد اقبال یاسر' حسین احمد پراچہ' شاہد حسن' ارشد جاوید اور سید وزیر حسین شیرازی صاحبان کا شکریہ بھی لازم ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے اس مجموعے کی ترتیب و اشاعت میں میرے معاون ہوئے۔

میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر صاحب کا بھی ممنون ہوں جو میرے دوست ہونے کے

علاوہ میرے افسر بھی ہیں اور جنہوں نے افسری کے علی الرغم، مجھے چپ کی گپھا میں بےخود خزیدہ اور مست رہنے کے مواقع فراخدلی سے بہم پہنچائے۔

آخر میں جناب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب اور جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی سپاس گزاری بھی مجھ پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے میری اس ناچیز کوشش پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمایا۔

خورشید رضوی

سرگودھا 16 مئی 1974ء

مکرّر

''شاخِ تنہا'' کا نقشِ اول پڑھنے والوں کی محبت کے سبب بہت جلد ختم ہو گیا تھا۔ اسبابِ ظاہری پر نظر کرتے ہوئے نقشِ ثانی کے امکانات بہت کم تھے۔ 1974ء میں اس کتاب کا اولین مسودہ عزیزم عبدالرؤف کی مساعی سے مرتب ہوا تھا۔ انہی کی محبت اس بار تکرارِ تمنا کا باعث بنی۔ چنانچہ یہ بھولی بسری نوا آپ اپنی بازگشت بن کر ایک بار پھر آپ کی سماعت پر دستک دے رہی ہے۔ امید ہے التفاتِ دل دوستاں سے محروم نہ رہے گی۔ محترم توصیف تبسم صاحب نے مفید مشوروں سے نوازا۔ برادرم خالد یوسفی صاحب نے قلم و مو قلم سے تعاون فرمایا میں ان کا سپاس گزار ہوں۔

خورشید رضوی

مزید

''شاخِ تنہا'' کی تیسری اشاعت بھی اب ایک عرصے سے دستیاب نہیں اہلِ ذوق کی طلب نے تحریک مہیا کی اور برادرم صفدر حسین کی محبت نے چوتھی بار اس کا نقش اُبھارا۔ میں تہِ دل سے اُن کا سپاس گزار ہوں۔

گزشتہ اشاعتوں میں برادرِ عزیز عبدالرؤف کی مساعی نمایاں رہیں۔ افسوس کہ اس اشاعت کے وقت دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں۔ آمین

خورشید رضوی

○

کانٹوں سے بھرے بن میں رستے کی بنا ڈالی
دے دے کے لہو طرحِ نقشِ کفِ پا ڈالی

بدلے میں دفینے کے قطرے ہیں پسینے کے
کیوں دل کی گواہی پر دیوار گرا ڈالی

پھر آج فضاؤں کو مطلوب ہے خوں ریزی
بادل کی زرہ پہنی، شمشیرِ صبا ڈالی

دو حرف تسلّی کے جس نے بھی کہے اُس کو
افسانہ سنا ڈالا، تصویر دکھا ڈالی

دنیا رہی خوابیدہ، خورشید نے شب بھر میں
پچھم سے شفق لا کر پورب میں بچھا ڈالی

○

میں سوچتا تھا کہ وہ زخم بھر گیا کہ نہیں
کھلا دریچۂ درآئی صبا، کہا کہ نہیں

ہوا کا رُخ تو اُسی بام و در کی جانب ہے
پہنچ رہی ہے وہاں تک مری صدا کہ نہیں

زباں پہ کچھ نہ سہی سن کے میرا حال تباہ
ترے ضمیر میں ابھری کوئی دعا کہ نہیں

لبوں پہ آج سرِ بزم آ گئی تھی بات
مگر وہ تیری نگاہوں کی التجا کہ "نہیں"

خود اپنا حال سناتے حجاب آتا ہے
ہے بزم میں کوئی دیرینہ آشنا کہ نہیں

ابھی کچھ اس سے بھی نازک مقام آئیں گے
کروں میں پھر سے کہانی کی ابتدا کہ نہیں

پڑو نہ عشق میں خورشید ہم نہ کہتے تھے
تمہیں بتاؤ کہ جی کا زیاں ہوا کہ نہیں

○

گو نظر اکثر وہ حُسنِ لازوال آ جائے گا
راہ میں لیکن سرابِ ماہ وسال آ جائے گا

یا شکن آلود ہو جائے گی منظر کی جبیں
یا ہماری آنکھ کے شیشے میں بال آ جائے گا

ریت پر صورت گری کرتی ہے کیا بادِ جنوب
کوئی دم میں موجۂ بادِ شمال آ جائے گا

دوستو! میری طبیعت کا بھروسہ کچھ نہیں
ہنستے ہنستے آنکھ میں رنگِ ملال آ جائے گا

جانے کس دن ہاتھ سے رکھ دوں گا دنیا کی زمام
جانے کس دن ترکِ دنیا کا خیال آ جائے گا

حادثہ یہ ہے کہ ساری ذلتوں کے باوجود
رفتہ رفتہ زخم سوئے اندمال آ جائے گا

○

تیرِ دل میں نہ رہا، بامِ حسیں پر نہ رہا
اب وہ مہتابِ دل افروز کہیں پر نہ رہا

دل میں اندوہِ جدائی ہے نہ شوقِ دیدار
عمر گزری کہ کوئی نقش نگیں پر نہ رہا

جانے کیا کہہ کے سرِ شام ستارہ گزرا
رات بھر پائے دلِ زار زمیں پر نہ رہا

آ کے اڑتا ہے کہاں ناخنِ تدبیر کا رنگ
جب اُدھر داغِ مقدّر بھی جبیں پر نہ رہا

جیسے افلاک پہ بادل کا گزر تک بھی نہ ہو
اب کہیں رنگِ طرب طبعِ حزیں پر نہ رہا

○

یہ جام و بادہ و مینا تو سب دلاسے ہیں
لبوں کو دیکھئے وہی عمر بھر کے پیاسے ہیں

کرو جو یاد تو ہم سے بھی نسبتیں ہیں تمہیں
وہ نسبتیں جو کفِ پا کو نقشِ پا سے ہیں

ذرا میں زخم لگائے ذرا میں دے مرہم
بڑے عجیب روابط مرے صبا سے ہیں

ترے بغیر بھی کٹتی رہی، ذرا نہ رکی
شکایتیں مجھے عمرِ گریز پا سے ہیں

نہ بہہ سکیں تو رگوں میں رواں دواں نشتر
نکل بہیں تو یہ آنسو ذرا ذرا سے ہیں

○

رمز یہ کھل جائے تو دنیا میں دل پھر کیا لگے
پاس سے دیکھیں تو مٹی، دور سے دریا لگے

دل میں یوں اترا کسی کی ساعدِ سیمیں کا دھیان
شاخِ گل جس طرح دیوارِ قفس سے آ لگے

کھل رہی ہے گوشہ گوشہ مجھ پہ چشمِ التفات
وہ سہیں پتھر کا ہو جائے تو کیا اچھا لگے

خون رو دیتی ہے ہر موجِ صبا کے سامنے
دیکھنے میں آنکھ اپنی لاکھ بے پروا لگے

کٹ گیا دورِ خزاں فصلِ بہار آ بھی گئی
دیکھتے ہیں اب ہمیں کس بات کا دھڑکا لگے

○

یہی ہے عشق کہ سر دو، مگر دہائی نہ دو
وفورِ جذب سے ٹوٹو، مگر سنائی نہ دو

زمیں سے ایک تعلق ہے ناگزیر مگر
جو ہو سکے تو اسے رنگِ آشنائی نہ دو

یہ دور وہ ہے کہ بیٹھے رہو چراغ تلے
سبھی کو بزم میں دیکھو مگر دکھائی نہ دو

شہنشہی بھی جو دل کے عوض ملے تو نہ لو
فرازِ کوہ کے بدلے بھی یہ ترائی نہ دو

جوابِ تہمتِ اہلِ زمانہ میں خورشید
یہی بہت ہے کہ لب سی رکھو صفائی نہ دو

○

دیکھتا ہوں پھول اور کانٹے بہر سو آج بھی
یاد کرتا ہوں تری خوشبوٗ تری خو آج بھی

جانے کیوں جلتی سلگتی شام کے ایوان میں
پھیل جاتی ہے تری باتوں کی خوشبو آج بھی

زیست کے خستہ شکستہٗ گنبدوں میں گاہ گاہ
گونجتا ہے تیری آوازوں کا جادو آج بھی

زلف کب کی آتش ایام سے کُمھلا گئی
زلف کا سایہ نہیں ڈھلتا سر مو آج بھی

تو نے اپنے ہاتھ سے جس پر لکھا تھا میرا نام
وہ صنوبر لہلہاتا ہے لبِ جو آج بھی

وہ ترا پل بھر کو ملنا پھر بچھڑنے کے لئے
دل کی مٹھی میں ہے اُس لمحے کا جگنو آج بھی

مدتیں گزریں مگر اے دوست تیرے نام پر
ڈول جاتی ہے مرے دل کی ترازو آج بھی

○

گلستاں میں زخمِ الفت سے کوئی خالی نہ تھا
خوشبوؤں کے تیر تھے بادِ صبا کا سینہ تھا

مجھ کو اپنی ذات کے ٹکڑے نظر آتے رہے
انجمن میں جو بھی تھا ٹوٹا ہوا آئینہ تھا

اب تو اک مدت سے اس کی دید بھی باقی نہیں
وہ حسیں منظر کہ جس کو دیکھنا کافی نہ تھا

صحبتِ ناجنس میں لے کر پھریں جنسِ گراں
اہلِ دل کا روزِ اوّل سے یہی روزینہ تھا

لٹ گیا سو بار لب تک آتے آتے ہر سخن
ورنہ جب دل سے چلا تھا اک عجب گنجینہ تھا

○

پھر آج اپنے گریباں میں غوطہ زن ہو لیں
پڑی ہیں جو تہِ دل میں وہ سیپیاں کھولیں

کسی کو دھیان میں لا کر کہیں کچھ ایسی بات
کہ آس پاس کے سب سامنے گھر رولیں

وہ ایک پل، وہ ترے لب سے ایک میٹھا بول
پھر آج تلخیٔ ایام میں اسے گھولیں

میں اُس مکاں میں ہوں جس میں پکاریے تو کہیں
کوئی جواب نہ دے اور بام و در بولیں

سفر نصیب ہیں ہم، ہم کو منزلوں سے کیا
یہی بہت جو کجاوے کی ٹیک سے سو لیں

تو اُن کی چشم و نگہ پر تو کان دھر کے دیکھ
جو اپنی کشتِ زباں میں خموشیاں بو لیں

○

خشک پتلی سے کوئی صورت نہ ٹھہرائی گئی
آنکھ سے آنسو گئے میری' کہ بینائی گئی

صبح دم کیا ڈھونڈتے ہو شب رووں کے نقشِ پا
جب سے اب تک بارہا موجِ صبا آئی گئی

رو رہا ہوں ہر پرانی چیز کو پہچان کر
جانے کس کی روح میرے روپ میں لائی گئی

مطمئن ہو دیکھ کر تم رنگِ تصویرِ حیات
پھر وہ شاید وہ نہیں جو مجھ کو دکھلائی گئی

چلتے چلتے کان میں کس کی صدا آنے لگی
یوں لگا جیسے مری برسوں کی تنہائی گئی

ہم کہ اپنی راہ کا پتھر سمجھتے ہیں اسے
ہم سے جانے کس لئے دنیا نہ ٹھکرائی گئی

○

دل میں وہ جا بسا، رگِ جاں کاٹتا ہوا
لو آج ہم نے آنکھ سے دیکھا، سنا ہوا

منزل ہے دور، اور کوئی ہم سفر نہیں
آئینہ ہے سو گردِ سفر میں اٹا ہوا

دل چل پڑے تو مصلحتیں دیکھتا نہیں
ریگِ رواں میں بھی ہے یہ لنگر اٹھا ہوا

پامال کر کے مجھ کو، چلا ڈھونڈنے مجھے
مفلس کے گھر میں ہوں میں خزانہ دبا ہوا

دل بستگی جہاں میں کسی سے بھی ہو، غلط
کچھ اور غم رہے گا اگر باوفا ہوا

اُس اِک ستوں کی کیفیتِ گومگو نہ پوچھ
ملبے کے ڈھیر میں ہو جو تنہا کھڑا ہوا

دل کے معاملوں میں زباں معتبر نہیں
ہے معتبر نظر سے نظر کا کہا ہوا

سر تیلیوں سے پھوڑ رہا ہے اسیر اور
دروازہ پشت پر ہے قفس کا کھلا ہوا

کشتی خدا پہ چھوڑ کے رنگ اڑ گیا ہے کیوں
گویا خدا خدا نہ ہوا، ناخدا ہوا

دل میں لہو نہ ہو تو گلو میں نوا کہاں
کیا کیا خیال زیرِ زباں ہے رکا ہوا

خورشیدؔ اب کہاں ہے، کسی کو پتا نہیں
گزرا تو تھا کسی کا پتا پوچھتا ہوا

○

سیلِ ماضی کو نشیبِ جاں میں بھرنے دیجیے
آج پھر احساس کو ڈھلنے سنورنے دیجیے

آنکھ مت جھپکائیے، تارِ نظر مت توڑیے
چاند کو دل کے سویدا تک اترنے دیجیے

ڈھونڈیے موجِ صبا میں ڈھل کے اُس کو ڈھونڈیے
قریہ قریہ، کوبکو، خود کو بکھرنے دیجیے

روکیے اشکوں کی گرتی چلمنوں کو روکیے
اِن دریچوں میں کوئی صورت ابھرنے دیجیے

سامنے ہے اُس کو آنکھوں میں بسالے جائیے
عمر بھر اِس ایک پل کو مت گزرنے دیجیے

○

جب کبھی سازِ سخن پر سوزِ دل گاؤں گا میں
پھوٹتے نغموں میں تجھ کو روبرو پاؤں گا میں

آج تک ڈھونڈا کسی کا گوشۂ دامن عبث
آج سے اپنے گریباں میں اتر جاؤں گا میں

میری صورت میری تنہائی کے آئینے میں دیکھ
انجمن کی گرد میں کس کو نظر آؤں گا میں

اُس غزل کی جان کو ذوقِ غزل فہمی نہیں
دل کے ٹکڑوں کی یہ مالا کس کو پہناؤں گا میں

انجمن در انجمن بکھروں گا دن کے ساتھ ساتھ
شام ہوگی، اپنے پیکر میں سمٹ آؤں گا میں

○

کہاں ہوں میں کہ مرا کوئی آشنا بھی نہیں
کسی کا ذکر تو کیا، گھر میں آئنہ بھی نہیں

رہے خموش تو ٹوٹا نہ رشتۂ اُمید
پکارتے تو خرابوں میں کوئی تھا بھی نہیں

تری صدا پہ تو صدیاں بھی لوٹ آتی ہیں
مجھے بُلا، میں کچھ ایسا شکستہ پا بھی نہیں

یہ اور بات کہ نقشِ قدم دکھائی نہ دیں
مگر وہ عرصۂ دل سے ابھی گیا بھی نہیں

اُس اعتراف سے رس گھل رہا ہے کانوں میں
وہ اعتراف جو اُس نے ابھی کیا بھی نہیں

جس ایک چیز سے تیرا فراق آساں ہے
وہ ایک چیز تری یاد کے سوا بھی نہیں

مرا بھرم ہیں تغافل شعاریاں تیری
تو پوچھ لے تو مرا کوئی مدّعا بھی نہیں

مصالحت بھی نہیں ہے سرشت میں اپنی
مگر کسی سے تصادم کا حوصلہ بھی نہیں

نہ جانے کب نہ رہیں ہم، ہمیں غنیمت جان
حیات و موت میں کچھ ایسا فاصلہ بھی نہیں

مآلِ کار قناعت ہے سو ابھی سے سہی
وگرنہ طولِ تمنا کی انتہا بھی نہیں

○

گئے دنوں کا جو اب سے موازنہ کیجے
تو ایک خنجرِ نادیدہ دل پہ چلتا جائے

کہاں وہ محفلِ احباب نور سے جس کے
ہر ایک سایۂ احساسِ درد ڈھلتا جائے

سروں پہ جھوم کے شاخِ زمانہ ہو گلریز
تو ہم خلشِ خارِ گل پہ ٹلتا جائے

تبسموں سے تبسم کو راہ ملتی رہے
چراغ سے کوئی جیسے چراغ جلتا جائے

کہاں وہ نقشِ کفِ پا کہ صورتِ مہِ نو
قدم قدم پہ نیا پیرہن بدلتا جائے

چلے جو تارِ نظر اُس کی پیروی کے لئے
تو گام گام پہ گرتا چلے سنبھلتا جائے

گھِبے گھِبے وہ برقِ عنایتیں جن سے
ضمیر میں شجرِ صد امید پھلتا جائے

کہاں یہ اجنبیوں کے دیارِ تیرہ و تار
کہ اپنے پاؤں کی آہٹ سے جی دہلتا جائے

نہ کوئی قرب کی خوشبو نہ کوئی لطف کا رنگ
ہر ایک لمحہ بہاروں کا ہاتھ ملتا جائے

نفس نفس وہی یادوں کی ہشت پہلو کٹار
کہ جس کی دھار پہ کٹ کٹ کے دل پگھلتا جائے

بس اب تو اک شجرِ سایہ دار کی ہے تلاش
ہوائیں چلتی رہیں اور جی بہلتا جائے

○

کوئی سوال نہ کوئی جواب دل میں ہے
بس ایک درد و الم کا سحاب دل میں ہے

جراحتیں جو لگیں تن پہ زیبِ تن کر لیں
جو دل کے زخم تھے ان کا حساب دل میں ہے

اگر لہو ہے تو آنکھوں میں کیوں نہیں آتا
یہ موجِ خوں ہے کہ موجِ سراب دل میں ہے

مدام ظاہر و باطن میں یہ خلیج رہی
نگاہ غرقِ گنۂ احتساب دل میں ہے

صحیفۂ الم روزگار ہاتھوں میں
کھلی ہوئی ترے غم کی کتاب دل میں ہے

نظر کے سامنے اٹھیں گے روز حشر مگر
وہ دل میں دفن رہے گا جو خواب دل میں ہے

اگر جگر میں ہو سارے جہاں کا درد تو خیر
یہ کیا کہ سارے جہاں کا عذاب دل میں ہے

○

کتنے دل کش کچھ اندھیرے کچھ اجالے ہو گئے
چاند پس منظر میں نکلا، پیڑ کالے ہو گئے

ذوقِ گویائی تو ہے پر تابِ گویائی کہاں
لفظ خود آ کر مرے ہونٹوں پہ تالے ہو گئے

دیکھنے میں کتنے پائندہ سہارے تھے مگر
ہاتھ میں آئے تو سب مکڑی کے جالے ہو گئے

دیدنی تھی فصلِ گل میں تندیٔ خونِ حیات
یاسمن کے پھول یوں بھڑکے کہ لالے ہو گئے

ہم نے تنہائی کی دھن میں ہائے کیوں چھوڑا وطن
اجنبی سب رفتہ رفتہ دیکھے بھالے ہو گئے

اوّل اوّل وقفِ حیرانی رہے دنیا کے ساتھ
ہوتے ہوتے ہم بھی دنیا سے نرالے ہو گئے

○

جب کبھی خود کو یہ سمجھاؤں کہ تو میرا نہیں
مجھ میں کوئی چیخ اٹھتا ہے، نہیں' ایسا نہیں

وارداتِ دل کا قصہ ہے غمِ دنیا نہیں
شعر تیری آرسی ہے' میرا آئینہ نہیں

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اِس گلی کے دوسری جانب کوئی رستا نہیں

تم سمجھتے ہو بچھڑ جانے سے مٹ جاتا ہے عشق
تم کو اِس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں

اُن سے مل کر بھی کہاں مٹتا ہے دل کا اضطراب
عشق کی دیوار کے دونوں طرف سایا نہیں

کب تری بوئے قبا سے بے وفائی دل نے کی
کب مجھے بادِ صبا نے خون رلوایا نہیں

مت سمجھ میرے تبسم کو مسرت کی دلیل
جو مرے دل تک اترتا ہو یہ وہ زینہ نہیں

یوں تراشوں گا غزل میں تیرے پیکر کے نقوش
وہ بھی دیکھے گا تجھے جس نے تجھے دیکھا نہیں

ثبت ہیں اس بام و در پر تیری آوازوں کے نقش
میں، خدا ناکردہ، پتھر پوجنے والا نہیں

خامشی، کاغذ کے پیراہن میں لپٹی خامشی
عرضِ غم کا اس سے بہتر کوئی پیرایہ نہیں

کب تلک پتھر کی دیواروں پہ دستک دیجیے
تیرے سینے میں تو شاید کوئی دروازہ نہیں

○

آؤ پل بھر محو ہو جائیں خیالِ یار میں
سیج پر پھولوں کی سو جائیں جہانِ خار میں

فرق ہوتا ہے بہت، اِس فرق کو پہچانیے
دیدۂ بے خواب میں اور دیدۂ بیدار میں

یہ خزاں کا رنگ ہے یا زرد رُو آکاس بیل
دھوپ کی مانند ہے پھیلی ہوئی اشجار میں

جم گیا ہے جب سے دل میں سر کٹانے کا خیال
ہم کو جانے کیا نظر آنے لگا تلوار میں

میں اگر چپ ہوں تو سمجھو نافہ، سر بند ہوں
جو سخن لب تک نہ آیا بس گیا کردار میں

○

درِ خزینۂ صد راز کھولتا ہے کوئی
نہ جانے کون ہے وہ، مجھ میں بولتا ہے کوئی

عجب کریدؔ عجب بے کلی سی ہے جیسے
مجھے مری رگِ جاں تک ٹٹولتا ہے کوئی

ہجوم ہے مرے سینے میں ابر پاروں کا
گہر بکھیر نے والا ہوں، روتا ہے کوئی؟

حیات و مرگ و طلوع و غروب ہے دنیا
کہ پر سمیٹتا ہے کوئی، تولتا ہے کوئی

ہوا کا لمس، یہ بوندیں خنک خنک خورشید
مجھے تو آج فضاؤں میں گھولتا ہے کوئی

○

خرد سے دور غمِ تُند خو میں اچھے تھے
اُسی جنوں میں اُسی ہاؤ ہو میں اچھے تھے

نکل کے آپ سے باہر خراب و خوار ہوئے
مدام غرق ہم اپنے لہو میں اچھے تھے

غرورِ زُہد سے رنجِ گناہ بہتر تھا
خرابِ شغلِ شراب و سبو میں اچھے تھے

وہ رائگاں بھی اگر تھی تو رائگاں نہ کہو
کہ روز و شب مرے اُس جستجو میں اچھے تھے

اگر چہ وہ بھی نہ تھے حسبِ آرزو لیکن
وہ دن 'کہ جو تری آرزو میں' اچھے تھے

ہوا ہوئی ہے موافق' ہمیں وہیں لے چل
سفینہ راں! ہم اُسی آبجو میں اچھے تھے

○

سینوں میں تپش ہے کبھی شورش ہے سروں میں
کیا چیز بسا دی گئی، مٹی کے گھروں میں

چلتا ہوں سدا ساتھ لئے اپنی فصیلیں
پہچان سکا کون مجھے ہم سفروں میں

اُڑنا ہے تو تہذیب کرو سوزِ دروں کی،
یہ ورنہ کہیں آگ لگا دے نہ پروں میں

غیروں میں ہوئی عام تری دولتِ دیدار
اک کحلِ بصر تھا کہ لٹا بے بصروں میں

دو گام پہ تم خود سے بچھڑ جاتے ہو خورشیدؔ
اور لوگ سمجھتے ہیں تمہیں راہبروں میں

○

کچھ مہک اُس نافۂ گم گشتہ کی لاتی تو ہیں
کچھ ہوائیں دشتِ ماضی سے اِدھر آتی تو ہیں

جنگلوں کو روح ترسے گی تو جاؤ گے کہاں
ہر طرف آبادیاں بڑھتی چلی جاتی تو ہیں

لوگ پتھر ہو گئے سنجیدگی کے نام پر
شکر ہے ہم آج تک تھوڑے سے جذباتی تو ہیں

شکر ہے تارنگ کو قیدِ تنہائی نہیں
آنکھ کے زنداں میں اشکوں کے ملاقاتی تو ہیں

گم ہوں میں خورشیدؔ خاشاکِ بہارِ رفتہ میں
ورنہ شاخیں فصلِ گل میں اب بھی لہراتی تو ہیں

○

ناحق ہوئے خراب، اتر کر خزینے میں
وہ لعلِ شب چراغ کہاں اس دفینے میں

اے محوِ خواب غرفہ نشیں جھانک کر تو دیکھ
کن سیڑھیوں پہ ہے کفِ سیلاب زینے میں

یاں بُت شکن بہت ہیں، کوئی خود شکن نہیں
توڑے جو خود کو ڈوب کے اپنے پسینے میں

پھول اب بھی کھل رہے ہیں مگر وہ صبا کہاں
ہوتا ہے کتنا فرق مہینے مہینے میں

شاید کسی بھنور میں کھُلے ناخدا کی آنکھ
ساحل کے خواب دیکھ رہا ہے سفینے میں

مدت ہوئی کہ دل سے ترا نقش اڑ گیا
اب دیکھیں کس کا نام کھدے اِس نگینے میں

○

آیئے رو لیں کہیں رونے سے چین آ جائے گا
ورنہ دردِ دل بھری محفل میں پکڑا جائے گا

چاند کی چاہت ہے لیکن چاند کو کم دیکھئے
ورنہ جب آنکھوں میں بس جائے گا گہنا جائے گا

جنبشِ موجِ صبا سے بھی اگر لب ہل گئے
بات پکڑی جائے گی محشر اٹھایا جائے گا

سردیوں کی اوس میں ٹھٹھرا ہوا اک اجنبی
کل تری دیوار کے سائے میں پایا جائے گا

دید کی مہلت تو ملتی ہے مگر کیا دیکھئے
آنکھ بجھ جائے گی آخر پھول کھلا جائے گا

اے صبا! فرصت نہیں خاکسترِ دل سے نہ کھیل
ہم اگر روئے ' تو پھر تا دیر رویا جائے گا

○

لب سے دل کا دل سے لب کا رابطہ کوئی نہیں
حسرتیں ہی حسرتیں ہیں مدّعا کوئی نہیں

حرفِ غم ناپید ہے' آنکھوں میں نم ناپید ہے
درد کا سیلِ رواں ہے راستا کوئی نہیں

اپنے من کا عکس ہے' اپنی صدا کی بازگشت
دوست' دشمن' آشنا' نا آشنا' کوئی نہیں

سب کے سب اپنے گریبانوں میں ہیں ڈوبے ہوئے
گُل سے گُل تک رشتہ' موجِ صبا کوئی نہیں

حالِ زار ایسا کہ دیکھے سے ترس آنے لگے
سنگدل اتنے کہ ہونٹوں پر دعا کوئی نہیں

کیا کوئی راکب نہیں ہم میں سمندِ وقت کا
نقشِ پا سب ہیں تو کیا زنجیرِ پا کوئی نہیں

میں تو آئینہ ہوں سب کی شکل کا آئینہ دار
بزم میں لیکن مجھے پہچانتا کوئی نہیں

دل کے ڈوبے سے مٹی دستِ شناور کی سکت
موج کی طغیانیوں سے ڈوبتا کوئی نہیں

آنکھ میچو گے تو کانوں سے گزر آئے گا حسن
سیل کو دیوار و در سے واسطہ کوئی نہیں

عرش کی چاہت ہو یا پاتال کا شوقِ سفر
ابتدا کی دیر ہے پھر انتہا کوئی نہیں

کاروانِ خورشید جانے کس گپھا میں کھو گیا
روشنی کیسی کہ صحرا میں صدا کوئی نہیں

○

متحد باہمدگر مانندِ جسم و جاں رہے
ہم برنگِ زخمِ دل تم صورتِ پیکاں رہے

جیسے نافے کو لئے پھرتا ہے آہو دشت
ہم بھی اپنے سر باطن کے لئے زنداں رہے

خواہشوں کی چلمنیں روئے حقیقت پر رہیں
کیسے کیسے خواب اِن آنکھوں میں آویزاں رہے

تم صبا کی طرح آئے اور رخصت ہو گئے
ہم مثالِ شاخِ تنہا دیر تک لرزاں رہے

دل کے دامن میں رہا اک کرمکِ شب تاب سا
تم تصور میں کبھی پیدا کبھی پنہاں رہے

کون پہچانا کسی کو چار دن زیرِ فلک
لوگ آئے اور اپنے آپ میں مہماں رہے

○

سارا جہان سرد و سیہ' یاس کی طرح
دل اُس میں ٹمٹماتی ہوئی آس کی طرح

رُخ سے عیاں بھی ہے' مرے دل میں نہاں بھی ہے
تیرا خیال شدّتِ احساس کی طرح

تجھ سے بچھڑ کے صحبتِ گُل میں ملا قرار
اس میں بھی کچھ تو ہے' تری بوباس کی طرح

ترسے کسی کے بوسۂ پا کو بھی عمر بھر
سنسان راستوں پہ اُگی گھاس کی طرح

کانوں میں پھول پہنے ہوئے کنجِ دل میں آج
اترا ہے کون شاخِ املتاس کی طرح

یونہی، کہیں کہیں، تری یادوں کے پھول تھے
تھی ورنہ زندگی کسی بن باس کی طرح

خورشید اُس کی آنکھ کی تابانیاں نہ دیکھ
وہ زہر بھی ہے پارۂ الماس کی طرح

○

گھول جا دن بھر کا حاصل اس دلِ بے تاب میں
ڈوب جا، اے ڈوبتے سورج مرے اعصاب میں

آنکھ میں ہر لحظہ تصویریں رواں رہنے لگیں
جم گیا ہے خواب سا اک دیدۂ بے خواب میں

دل ہمارا شاخساروں سے، گلوں سے کم نہیں
اے صبا کی موجِ لرزاں! کچھ ہمارے باب میں

ہاں اسی تدبیر سے شاید بنے تصویرِ دل
رنگ ہم نے آج کچھ گھولے تو ہیں سیماب میں

دھیان بھی تیرا تری موجودگی سے کم نہ تھا
کنجِ خلوت میں بھی ہم جکڑے رہے آداب میں

دسترس ہے موج کی ساحل سے ساحل تک فقط
تہ کو جا پہنچے اگر اترے کوئی گرداب میں

پیشِ دل کچھ اور ہے پیشِ نظر کچھ اور ہے
ہم کھلی آنکھوں سے کیا کیا دیکھتے ہیں خواب میں

○

گفتگو ''ترکِ خامشی'' ہے فقط
ہم سفر ایک اجنبی ہے فقط

عہدِ رفتہ کے ولولوں کا نشاں
اک مسلسل سی بے کلی ہے فقط

دیکھنا بھالنا گیا ترے ساتھ
آنکھ مدت سے سوچتی ہے فقط

ہر طرف اک اتھاہ سناٹا
چاپ اپنی ہی گونجتی ہے فقط

ہر طرف بے پناہ تاریکی
اپنی آنکھوں کی روشنی ہے فقط

اجنبیت کے ان کدوں میں دوست
خود کلامی پہ زندگی ہے فقط

ہم کہاں اور جوازِ شکوہ کہاں
نالہ اظہارِ بے کسی ہے فقط

کر حفاظت متاعِ حیرت کی
حاصلِ زندگی یہی ہے فقط

اب دماغِ سخن بھی ہے کس کو
عمر مدت سے کٹ رہی ہے فقط

○

ہوا جو دل کی طرف کل صبا کا روئے سخن
تڑپ اٹھی مری نس نس میں آبجوئے سخن

کھلے جو زخم تو رہ رہ کے یاد آنے لگے
وہ جن کے قرب میں ہوتی رہی نموئے سخن

کبھی وہ دوست، کہ تھے دست و ساعد و بازو
وہ ہم پیالۂ احساس و ہم سبوئے سخن

وہ راز دار نگاہیں فصاحتوں کی امیں
وہ جن کے بعد نہ رہتی تھی جستجوئے سخن

کبھی وہ دل میں اُترتی ہوئی حسیں رفتار
وہ جس سے جلوہ گہِ کہکشاں تھی کوئے سخن

غزل غزل وہ ادائیں وہ عنبریں نشتر
وہ جن کی خامشیاں بھی لیے تھیں خوئے سخن

اور اب اُجاڑ ہے ہر شہرِ ظاہر و باطن
نہ سوز و سازِ خموشی نہ رنگ و بوئے سخن

گئی ہوئی ہے دیارِ طرب سے راہِ خیال
اَٹی ہوئی ہے غبارِ اَلم سے جوئے سخن

شہابِ ثاقبِ الہام اب کہاں خورشید
قلم کے زور سے رکھتا ہوں آبروئے سخن

○

پیشِ نظر جو پھر وہی دیوار و در ہوئے
بامِ تصورات پہ تم جلوہ گر ہوئے

ٹکڑے اڑے جگر کے تو نکھرا غزل کا روپ
ہم سنگ باریوں کے سبب شیشہ گر ہوئے

اُس پیرہن کے لمس کو ترسے ہیں عمر بھر
جس کے لئے غبارِ سرِ رہگزر ہوئے

آئی تری صدا تو سماعت میں ڈھل گئے
ابھرا ترا جمال تو تارِ نظر ہوئے

ان راستوں میں آج بھی ہے اُن دنوں کی باس
جو دن کسی کی ہمقدمی میں بسر ہوئے

دل آج بھی چراغ اُسی انجمن کا ہے
صدیاں گزر گئیں جسے زیرو زبر ہوئے

اب وہ دیار بھی ہمیں پہچانتا نہیں
اک عمر جس میں نالہ سرا در بدر ہوئے

راہیں کٹھن ہوئیں تو مہکنے لگی غزل
وہ محملِ سخن میں مرے ہمسفر ہوئے

خورشیدؔ میری سوختہ پائی کے فیض سے
سب نقشِ پا چراغِ سرِ رہگزر ہوئے

○

بڑا عجیب سماں آج رات خواب میں تھا
میں اُن کے پاس تھا، سیّارہ آفتاب میں تھا

صدف صدف جسے ڈھونڈ آئے ڈھونڈنے والے
خدا کی شان، وہ موتی کسی حباب میں تھا

اِدھر سے دست و نگاہ و زباں تمام سوال
اُدھر سے ایک سکوتِ گراں جواب میں تھا

ہوا میں ایک ادھورا فسانہ کہتا ہوا
یہ چاک چاک ورق جانے کس کتاب میں تھا

تمہاری بزم سے تنہا نہیں اٹھا خورشید
ہجوم درد کا اک قافلہ رکاب میں تھا

○

جئیں کچھ اور تو ہو جائے زندگی کچھ اور
ابھی تھی زہر ابھی انگبیں، ابھی کچھ اور

بجھا کے شمع نہ کر میرے غم کا اندازہ
شبِ فراق کی ہوتی ہے تیرگی کچھ اور

سنا ہے سانپ کے من میں ہے سانپ کا تریاق
اگر ہے یوں، تو ہمیں نیشِ آگہی کچھ اور

اِسی سبب سے نہیں صلح آئنے سے مری
کہ میں کچھ اور ہوں اور میری زندگی کچھ اور

قلندرانہ نہ کیوں جادۂ وفا پہ چلوں
کہ احتیاط سے بڑھتی ہے گمرہی کچھ اور

○

کچھ اس ادا سے کوئی دمبدم لبھائے مجھے
کہ ہارنے بھی نہ دے اور آزمائے مجھے

اس انتظار میں ہوں نقشِ رائگاں ہو کر
ترا کرم کسی محراب میں سجائے مجھے

ترے نثار کسی ایسے غم گسار کو بھیج
کہ دل کی بھول بھلیوں سے ڈھونڈ لائے مجھے

یہ جی میں ہے کہ سراپا وہ نغمہ بن جاؤں
کہ جس کو تجھ سے محبت ہو گنگنائے مجھے

کسی کی دھن میں پریشاں تو ہوں بکھر ہی نہ جاؤں
گلے نہ موجۂ بادِ صبا لگائے مجھے

گلوں سے کم نہیں کانٹوں کی سیج بھی خورشید
خیالِ یار اگر چین سے سلائے مجھے

○

رہینِ صد گماں بیٹھے ہوئے ہیں
مگر ہم رائگاں بیٹھے ہوئے ہیں

بظاہر ہیں بھری محفل میں لیکن
خدا جانے کہاں بیٹھے ہوئے ہیں

اِدھر صحنِ چمن میں مجھ سے کچھ دُور
وہ مجھ سے سرگراں بیٹھے ہوئے ہیں

اُدھر شاخِ شجر پہ دو پرندے
مثالِ جسم و جاں بیٹھے ہوئے ہیں

ستارے ہیں کہ صحرائے فلک میں
بھٹک کر کارواں بیٹھے ہوئے ہیں

کنویں کی تہ میں جھانکو عکس در عکس
یہاں سات آسماں بیٹھے ہوئے ہیں

کھنچی ہیں دل پہ پتھر کی لکیریں
نقوشِ رفتگاں بیٹھے ہوئے ہیں

ہمیں چاہو ہماری قدر کر لو
تمہارے درمیاں بیٹھے ہوئے ہیں

○

رہی ہے پردۂ اُلفت میں مصلحت کیا کیا
عداوتوں میں ہوئی ہے مفاہمت کیا کیا

مرے عزیز وطن کی فضا نے بھر دی ہے
مری سرشت کے اندر منافقت کیا کیا

کبھی اصول کی غیرت کبھی زیاں کا سوال
دماغ و دل میں رہی ہے مشاورت کیا کیا

صدائے دل کو تہِ دل میں قید کر کے رکھا
رہا ہے طوقِ گلو شوقِ عافیت کیا کیا

مہک تھی جو لہو کی تو چونک کر ہم نے
ہوا سے پوچھی ہے زخموں کی خیریت کیا کیا

بہت عزیز ہیں آنکھوں کی پتلیاں لیکن
ملے ہیں دُکھ بھی مجھے اِن کی معرفت کیا کیا

بہت دنوں میں کل آئینہ سامنے پا کر
ہوئی ہے عمرِ گزشتہ کی تعزیت کیا کیا

اَٹا ہوا بسر و چہرہ سیم و زر کا غبار
ملی ہے لاشۂ افکار کی دیت کیا کیا

نہاں ہے ترکشِ امکاں میں ناوکِ تقدیر
مدام سر پہ ستارے ہیں اَن گنت کیا کیا

○

مدتوں کی خشک پلکوں کو بھگونا چاہیے
سایۂ اشجار میں تا دیر رونا چاہیے

ایں سوئے افلاک ہنگامے بپا ہیں نو بہ نو
آں سوئے افلاک آخر کچھ تو ہونا چاہیے

مزرعِ ہستی میں ہنگامِ درو بھی آئے گا
سوچ کر اس سرزمیں میں بیج بونا چاہیے

آنکھ کھلنے پر ملے شاید مرادوں کا جہاں
چند صدیوں تک کہیں غاروں میں سونا چاہیے

ایک جانب گریۂ شب ایک جانب قہقہے
کس لڑی میں دوستو! خود کو پرونا چاہیے

○

اس جہاں کے تو ہے شایاں صرف مرنے کی امنگ
لغو ہے کتنی یہاں کچھ کر گزرنے کی امنگ

کس طرح دنیا سے رخصت ہو پریشانی کہ ہے
ذرّے ذرّے کی طبیعت میں بکھرنے کی امنگ

دمبدم دستِ فنا میں سوچتا ہے اب حباب
جانے کیوں سر میں سمائی تھی ابھرنے کی امنگ

اب تو جینے کی یہی صورت ہے اے اہلِ جنوں
چھوڑ کر نقشِ جہاں میں رنگ بھرنے کی امنگ

اک بہشتِ بے خودی اور لذتِ برگِ حشیش
سایۂ تاک اور دل میں کچھ نہ کرنے کی امنگ

○

یا تو اُس برقِ تپاں کا سامنا مت کیجیے
یا دمِ تیغِ تجلی کا گلا مت کیجیے

گم نہ ہو جائیں کہیں اِک دن ہجومِ عکس میں
اِس قدر سینے کو آئینہ نما مت کیجیے

گنبدِ دل میں ابد تک گونجتی ہے ہر نوا
آپ خود ڈر جائیں گے اِس میں صدا مت کیجیے

موج سے لیجے خضر کی آمد و شد کا سراغ
سطحِ دریا پر تلاشِ نقشِ پا مت کیجیے

ہستیٔ تارِ نفس ہے مثلِ تارِ عنکبوت
کیجیے کیا اِس جہاں میں اور کیا مت کیجیے

○

سینے میں میرے خلدِ بریں کی روش بھی ہے
دوزخ کے شعلہ شعلہ نفس کی تپش بھی ہے

وہ آرزو بھی ہے کہ سوئے عرش لے اڑے
اور اس کے ساتھ ساتھ زمیں کی کشش بھی ہے

گو ہے اسی کی آمد و شد پر مدارِ زیست
تارِ نفس میں تیغِ دو دم کی بُرِش بھی ہے

حدِّ[1] نظر پہ خضر بھی ہے منتظر مگر
رستے میں ہر قدم پہ کھڑا راکھشش بھی ہے

جو گاہ گاہ آنکھ کو نم دیدہ کر سکے
باطن میں آپ کے کوئی ایسی خلش بھی ہے

---

[1] اس لفظ میں تصرف پر علماء سے معذرت

○

جانے کس کس کا شریکِ انجمن یادوں میں ہے
ایک پہلو سے دلِ پابند آزادوں میں ہے

دیدہ و دل اب بھی جاگ اٹھتے ہیں تیرے نام پر
حسرتِ تعمیر اب تک خانہ بربادوں میں ہے

وہ جو توڑے گا طلسمِ سامری وہ بھی اِنہی
راہ سے بھٹکے ہوئے لب تشنہ شہزادوں میں ہے

ہر عمارت میں نظر آنے لگے گی ایک دن
یہ کجی جو اِن دنوں آنکھوں کی بنیادوں میں ہے

ہو کسی کا صید تو ہم ڈھال بن جائیں مگر
اس کا کیا کیجئے کہ دل آپ اپنے صیادوں میں ہے

○

وہ قناعت کا طلسمِ خواب گوں جاتا رہا
رشک جب سے آنکھ میں آیا سکوں جاتا رہا

ذہن کے مقتل میں امکانوں کی لاشیں بھر گئیں
وہ یقینِ بے قیاس و بے چگوں جاتا رہا

کیوں کشادِ کار میں اکثر گرہ رہنے لگی
کار فرما تھا جو دستِ غیب کیوں جاتا رہا

حادثہ یہ ہے کہ سیلابِ زماں کے رو برو
لوحِ دل سے رفتہ رفتہ نقشِ خوں جاتا رہا

اب دیے لاکھوں بھی جل جائیں تو ظلمت کم نہ ہو
وہ چراغانِ جہانِ اندروں جاتا رہا

○

آوارۂ غربت ہوں ٹھکانہ نہیں ملتا
ناوک ہوں مجھے کوئی نشانہ نہیں ملتا

جن لوگوں میں رہتا ہوں میں اُن میں سے نہیں ہوں
ہوں کون؟ مجھے اپنا زمانہ نہیں ملتا

دیوار تو اِس دور میں ملتی ہے بہر گام
لیکن تہِ دیوار خزانہ نہیں ملتا

مدت سے ہے اشکوں کا تلاطم پسِ مژگاں
رونے کے لئے کوئی بہانہ نہیں ملتا

مدت سے تمنا ہے کہ یہ بوجھ اتاریں
مدت سے کوئی دوست پرانا نہیں ملتا

ہے رخش سبک سیر بہت عمرِ رواں کا
گر جائے کوئی شے تو اٹھانا نہیں ملتا

○

پہلے جہاں کے رنج و محن میں لگا دیا
دل دُکھ گیا تو مشقِ سخن میں لگا دیا

جب ہم ہرے بھرے تھے تو تھے وقفِ دشت و در
دن ڈھل گئے تو صحنِ چمن میں لگا دیا

جز اس کے کیا کہوں کہ خدا نے کہیں کہیں
اک روح کا سا ہاتھ بدن میں لگا دیا

کیا اب بھی زندہ ہے وہ جراحت کہ دل میں تھی
پیوندِ خوں یہ کس نے کفن میں لگا دیا

خورشید اب سخن ترا رنگیں کہاں سے ہو
سارا لہو تو اُس کی لگن میں لگا دیا

○

بے دلی زوروں پہ تھی گلشن بھی ویرانہ رہا
ہم بھی بیگانے رہے سبزہ بھی بیگانہ رہا

دل رہا آشوبِ تنہائی میں پیہم سینہ کوب
یوں تعلق تو سبھی سے آشنایانہ رہا

توڑتا ہے کون شب بھر جسم کی دیوار کو
بند مجھ میں عمر بھر یہ کون دیوانہ رہا

خواب میں بھی اُن کی صورت دیکھنا ہے اب محال
جن کا میری آنکھ کی پتلی میں کاشانہ رہا

چار سو تپتے حقائق کی کڑی بے مہر دھوپ
دل پہ لیکن سایۂ آنگن ایک افسانہ رہا

○

بات وہ کہتا ہوں جو ہم رنگِ خاموشی رہے
درس وہ دیتا ہوں جو رہنِ فراموشی رہے

آدمی پر تلخ ہو جاتا ہے ظاہر کا سفر
راہ میں حائل اگر باطن کی سرگوشی رہے

اہلِ دل کے نام کیا شرطِ گراں لکھ دی گئی
دل تبھی رہتا ہے جب ذوقِ زیاں کوشی رہے

نقشِ ماتم تا ابد نقشِ جبیں ہو یا نہ ہو
تا ابد لیکن طبیعت کی سیہ پوشی رہے

خواب کو تعبیر ملتی ہے، غموں کو اعتدال
ہوش میں شامل اگر تھوڑی سی بے ہوشی رہے

○

سب داغ ہیں بیدار بہت، سینے کے اپنے
موہوم ہیں آثار بہت، جینے کے اپنے

بند آنکھ کیے کانِ جواہر میں کھڑا ہوں
گوہر مجھے یاد آتے ہیں گنجینے کے اپنے

اتنے بھی نہ ہوں اپنی اداؤں کے قتیل آپ
آئینے میں کچھ رنگ ہیں آئینے کے اپنے

خود اُڑ کے پہنچتا ہے ہمیں رزق ہمارا
کیوں خوار پھریں کھوج میں روزینے کے اپنے

یا ایک نیا خلعتِ شاہانہ بہرگام
یا پھر یہی دو رخت ہوں پشمینے کے، اپنے

○

تو ہے کہ چیستاں کی عبارت ہے تہ بہ تہ
دل ہے کہ سنگ بستۂ حیرت ہے تہ بہ تہ

جو آنکھ دیکھنے میں خرابہ دکھائی دے
سمجھو کہ اُس میں کوئی امانت ہے تہ بہ تہ

بحرِ انا ہوں میری تہوں میں اتر کے دیکھ
خوابیدہ مجھ میں وقت کی میّت ہے تہ بہ تہ

وہ چشمِ سرمہ سا کہ جسے بے زباں کہیں
اُس کی خموشیوں میں اشارت ہے تہ بہ تہ

فرصت کہاں کہ غیر سے ہم دشمنی کریں
اپنا وجود ایک مصیبت ہے تہ بہ تہ

شاید کوئی گیا ہو زمانے سے کامگار
اپنی تو زیست کانِ ندامت ہے تہ بہ تہ

○

آدمی دل کے سویدا سے عبارت ہے فقط
ایک ہی پتھر پہ قائم یہ عمارت ہے فقط

ہاتھ میں امید کے ہے ایک تارِ عنکبوت
آنکھ میں اک واپسیں تارِ بصارت ہے فقط

پختگی کو آن پہنچا ہے خمیرِ بے دلی
راہ میں حائل کوئی دن کی حرارت ہے فقط

اے زباں ختم خموشی ہو کے دیکھیں آج سے
آج تک کی گفتگو ساری اکارت ہے فقط

چشم پوشی پر گزر اوقات کر لیتا ہے دل
زندگی کیا ہے، تغافل کی مہارت ہے فقط

○

یاد آیا ہے کوئی وجہ پریشانی تو تھی
آنکھ یوں خالی نہیں تھی، اس میں حیرانی تو تھی

لب پہ مہر خامشی پہلے بھی لگتی تھی مگر
آہ کی رخصت تو تھی، اشکوں کی ارزانی تو تھی

تھی نظر کے سامنے کچھ تو تلافی کی امید
کھیت سوکھا تھا، مگر دریا میں طغیانی تو تھی

بزم سے اٹھے تو کیا، خلوت میں جا بیٹھے تو کیا
ترک دنیا پر بھی دنیا، جانی پہچانی تو تھی

درد اک جوہر ہے، پیکر سے غرض رکھتا نہیں
آنکھ میں آنسو نہ تھے، لب پر غزل خوانی تو تھی

○

آ دلِ ناشاد چل اسبابِ ناشادی سے دور
مکتبِ فطرت میں استادوں کی استادی سے دور

پڑھ رہا ہوں سب کفِ دستِ مناظر کے نقوش
خیمہ زن ہوں خلوتِ کہسار میں وادی سے دور

سرنگوں بیٹھا ہوں اپنی ذات میں ڈوبا ہوا
اس جہانِ خوب و ناخوب و غم و شادی سے دور

دے رہائی کی سزا ذوقِ اسیری دیکھ کر
یہ ستم بھی تو نہیں ہے اس کی صیادی سے دور

شہر اجڑتا ہو تو ہم صحرا کا رستا لیں مگر
کس طرح بھاگے کوئی باطن کی بربادی سے دور

سوزِ دل میں گوندھ لو اپنی نوا کا تار و پود
گنگناؤ جا کے اِن شعروں کو آبادی سے دور

○

یہ تو "بہنا" ہے سراسر بے جدال و بے خلاف
"تیرنا" وہ ہے کہ ہو رفتارِ دریا کے خلاف

جی میں آتا ہے کہ اب سارے جہاں سے دور دور
کنجِ دل میں بیٹھیے اور سوچیے اپنے خلاف

ہے سرِ جلوت مرے حق میں رواں میری زباں
آئنہ خلوت میں بولے گا مگر میرے خلاف

میں ترا، میرے قدم تیرے، مرا رستہ ترا
اے خدا کیا خاک چل سکتا ہوں میں تیرے خلاف

جسم کو پابندِ رسمِ کارواں رہنا پڑا
تھی مگر دل کی روش سب سے الگ سب سے خلاف

○

کچھ فنا کے زیرِ پا ہوں، کچھ فنا آمادہ ہوں
خاک کا پتلا ہوا کی راہ میں استادہ ہوں

کر رہا ہوں ذرّہ ذرّہ ریگِ ساعت کا شمار
زندگانی کا اسیر اور موت کا دلدادہ ہوں

جھیلتا ہوں سختیاں، رنگِ طبیعت کے خلاف
وقت کے ہاتھوں گدا ہوں، اصل کا شہزادہ ہوں

صحبتِ ناجنس میں محصور ہوں شام و سحر
میں سمندر میں زمینِ خشکِ دور افتادہ ہوں

اتنا آساں ہوں کہ جس کو ماننا آساں نہیں
ہے یہی پیچیدگی میری کہ حرف سادہ ہوں

○

چار دن کو ہے یہاں شرطِ اقامت کیا کیا
فرصتِ زیست میں شامل ہے مصیبت کیا کیا

سرپھرے لوگ ہیں ہم اپنے جنوں کی رو میں
سوچ لیتے ہیں دلِ زار کی قیمت کیا کیا

وہ تو کہیے کہ گزر کر خس و خاشاک ہوئے
ورنہ سنگین تھی حالات کی صورت کیا کیا

آج مشکل ہے بہت وعدۂ فردا پہ یقیں
اور کل دوش پہ آئے گی ندامت کیا کیا

تم تو کیا ہو سرِ دیوار زمانہ خورشید
رائگاں ہو کے مٹا نقشِ فضیلت کیا کیا

○

کڑی ہے دھوپ، گھٹا بن کے خود پہ چھاتے جائیں
کسی کو یاد کریں اوس میں نہاتے جائیں

یہ دل کی بھول بھلیاں، یہ ایک سے رستے
ہر ایک موڑ پہ کوئی نشاں لگاتے جائیں

سیاہ کیوں ہو، یہ طاق و دریچہ و محراب
چلے ہیں گھر سے تو جلتا دیا بجھاتے جائیں

یہ میری آپ کی، ہمسائیگی کی آئنہ دار
جو ہو سکے تو یہ دیوار بھی گراتے جائیں

مذاق اہلِ جہاں کو بھلی لگے نہ لگے
شجر حجر تو سنیں گے، غزل سناتے جائیں

○

کہاں چلوں کہ جہاں دل دکھا سکے نہ کوئی
کسی پہ اپنی خدائی جتا سکے نہ کوئی

کہیں کسی کی طرف مڑ کے دیکھنا نہ پڑے
بجز ندائے محبتؔ بلا سکے، نہ کوئی

اگر کسی سے ملوں، کوئی سدِّ راہ نہ ہو
اگر بچوں تو مرے پاس آ سکے نہ کوئی

حدیثِ مکر و ریا کو سماعتیں نہ ملیں
حدیثِ لطف کو دل سے بھلا سکے نہ کوئی

سیاہ سر پہ کوئی دست اقتدار نہ ہو
مرے چراغ، مرا دل بجھا سکے نہ کوئی

کسی کی جنبشِ ابرو پہ جبرِ خندہ نہ ہو
حزیں ہو طبع، تو مجھ کو ہنسا سکے نہ کوئی

وہ چاہتا ہوں بہشتیں جو مل سکیں نہ کہیں
وہ مانگتا ہوں ستارے جو لا سکے نہ کوئی

○

بے خود صفتِ بادِ صبا آ کے گلے مل
کم کم کہیں کھلتے ہوئے پھولوں کے تلے مل

گلنار سے چہرے پہ رکھے دستِ حنا کو
ہم رنگِ شفق ہو کے کبھی شام ڈھلے مل

اب کوئی بھی شب بن ترے دیکھے نہ کٹے گی
اب چاند کی قندیل جلے یا نہ جلے مل

ہاں دل سے کبھی شوقِ ملاقات نہ نکلے
جب گردشِ افلاک ذرا سر سے ٹلے مل

پل بھر کو اگر جبر کا سیلاب تھمے، آ
دم بھر کو اگر وقت پہ کچھ زور چلے، مل

ناگفتہ بہاروں کے اشاروں کی سمجھ بات
جب سوکھی ہوئی شاخ ہری ہو کے پھلے، مل

دنیا کی نگاہوں سے نہاں آخرِ شب جاگ
جب صحنِ گلستاں میں کلی آنکھ ملے، مل

○

کیا کہیں کیونکر بسر ایامِ فانی ہو گئے
ہاتھ رکھا دل پہ محوِ سوز خوانی ہو گئے

دمبدم جلتے ہیں چوبِ خشکِ صحرا کی طرح
کاروانِ رفتہ ہم تیری نشانی ہو گئے

اُس پہ تیری آنکھ نے شبنم بھی ارزانی نہ کی
سنگریزے جس نواکاری سے پانی ہو گئے

ہم تلاشِ لعلِ بے ہمتا میں اب نکلے کہ جب
شام کے پرتو سے پتھر ارغوانی ہو گئے

اور کیا ہوگا جہاں کی بے ثباتی کا ثبوت
تم کہ سرتاپا حقیقت تھے کہانی ہو گئے

○

بزمِ جہاں میں جب کسی شے کی کمی نہ تھی
ہم نے وہ صبحِ عیش بھی دیکھی ترے بغیر

اب تو نہیں، تو ہے ترا غم شاملِ حیات
تیرے فراق میں بھی نہ گزری ترے بغیر

اک بے خودی میں ہم کو تھکن کا پتا نہ تھا
ورنہ رہِ حیات کٹھن تھی ترے بغیر

کیا کیا نہیں رہا میں فضاؤں سے شرمسار
جب چاندنی شباب پہ آئی ترے بغیر

اب کے بھی گلستاں سے بہاروں کا کارواں
بے رنگ و بو گزر گیا، یعنی ترے بغیر

○

وہ دن بھی تھے کہ صورتِ نام و نگیں تھے ہم
یہ دن بھی ہیں کہ جیسے کبھی دوستی نہ تھی

وہ ابتدائے عشق کے دن بھی تھے خوب دن
جب اپنے سر سے کج کلہی یوں گئی نہ تھی

حدِّ نظر پہ وہ بھی خراماں تھا روز و شب
اور صبر سے بھی دل کو ابھی دشمنی نہ تھی

وہ روز و شب کہ جن میں نگاہیں زبان تھیں
ہم چپ تھے، کوئی بات مگر ان کہی نہ تھی

اُس وقت بھی مگر یہی بے تابیاں تھیں دوست
اُس وقت بھی نویدِ سکوں تو ملی نہ تھی

حسرت وہ شمع ہے جسے بجھنا حرام ہے
عینِ وصال میں بھی یہ قاتل مٹی نہ تھی

بے جا ہے شکوۂ غمِ عشق اضطراب میں
تھا کب کہ اپنے دل کو کوئی بے کلی نہ تھی

○

دل میں کسک نہ آنکھ میں آنسو نہ سر میں خاک
اِس شہرِ بے حسی میں صبا رائگاں گئی

کیا ڈھونڈتے ہیں جلتے ہوئے خاروخس میں لوگ
بجلی زمیں کو چھو کے سوئے آسماں گئی

کہنے کو ساتھ ساتھ گئے ہم جہاں گئے
شیشے کی اک فصیل مگر درمیاں گئی

آئینہ کیوں نہ توڑ سکے بت شکن تھے آپ
کہیے تو اب وہ قوتِ بازو کہاں گئی؟

○

یہ کام چشمِ تصوّر کا ہے بہ فیضِ فراق
تجھے وصال میں جی بھر کے کس نے دیکھا ہے

کسی کو خونِ جگر بھی کسی کا ہے پایاب
کوئی کسی کی نگاہوں میں ڈوب جاتا ہے

بھرے جہاں میں بھی مُتّقی کہاں ہے تنہائی
حصارِ ذات مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

جہانِ غم سے تو پتھر اٹھا کے لاتا ہوں
گہر تو دل کی جوالا میں آ کے ڈھلتا ہے

○

فضا میں آج بہت دیر یاد آتے رہے
مجھے بہارِ گزشتہ کے بال و پر اپنے

چلو کہ دیکھ تو آئیں زمینِ اعدا میں
وہ اپنی جان سے پیارے مکاں، وہ گھر اپنے

فغاں! کہ دستِ عدو میں بنے ہوئے ہیں تبر
وہ اپنے ہاتھ کے بوئے ہوئے شجر اپنے

گُلوں نے مجھ کو بھی دی تھی صلائے گُل چینی
زمیں کا خون مگر کون اٹھائے سر اپنے

○

خدا کا نام اس محفل میں کوئی لے تو دل میں لے
ہجومِ نا امیداں کفر پر آمادہ بیٹھا ہے

سرِ خاکسترِ صد آرزو دل کا یہ عالم ہے
کہ جیسے دشتِ غربت میں کوئی شہزادہ بیٹھا ہے

ہزاروں فلسفوں کی خاک اڑائی تب کہیں جا کر
طبیعت میں خیالِ پیشِ پا افتادہ بیٹھا ہے

دلِ ہر ذرہ میں تھی حسرتِ ہمراہیٔ محمل
بہت تھک ہار کر آخر غبارِ جادہ بیٹھا ہے

○

تار ٹوٹا تھا مرے ساز کا، کچھ اور نہ تھا
جس کو اٹھ اٹھ کے ہر نغمہ سرا نے دیکھا

یوں وہ آنکھوں میں سمایا ہے کہ میں نے اُس کو
بارہا آئنہ داری کے بہانے دیکھا

ہم نے ایسے بھی کئی بار جلائے ہیں چراغ
جن کو دیکھا تو بس اِک موجِ ہوا نے دیکھا

وہ جو زنجیریِ نقشِ کفِ پا تھے تیرے
اُن کو مڑ مڑ کے بہت بانگ درا نے دیکھا

○

تیرے غبارِ رہ میں دھڑکتا ہے اُن کا دل
جو خاک ہو گئے ترے عزمِ سفر کے ساتھ

اے شمع! ایک تو ہی نہیں کشتۂ سحر
دل بھی بجھا بجھا ہے طلوعِ سحر کے ساتھ

چپ چاپ دیکھتے ہیں گزرتی بہار کو
کیا طاقتِ فغاں بھی گئی بال و پر کے ساتھ

○

غمِ حبیب! شکایت ہے زندگی سے مجھے
ترے بغیر بھی کٹتی رہی، ذرا نہ رکی

عناں گسستہ چلی تھی تمہاری زُلفوں سے
گلوں نے لاکھ صدا دی مگر صبا نہ رُکی

○

اُس کو فراق پر، مجھے ملنے پہ ضد رہی
زورِ بیاں نے زورِ بیاں کو کتر دیا

اُس نے مثالِ مہر و ستارہ بیان کی
میں نے اسے حوالۂ شاخ و شجر دیا

مجھ کو بھی ظلمتوں سے نکالے گا ایک دن
وہ، جس نے دستِ شب میں عصائے سحر دیا

○

ہزار شکر! سرِ شاخسار پھول کھلا
فغاں! کہ صحنِ گلستاں میں اِک کلی نہ رہی

تری گلی میں کوئی قسمت آزمائے کیا
کمند بام پہ پہنچی تو زندگی نہ رہی

○

ہنگامۂ زمانہ کی رونق اِسی سے ہے
قوس و خدنگ و صید بہم کر دیے گئے

کچھ تھے کہ جن کو ذوقِ اَلم دے دیا گیا
کچھ لوگ محوِ مشقِ ستم کر دیے گئے

گزرے کہاں ہیں دوست! زمانے وصال کے
اب وہ شبِ فراق میں ضم کر دیے گئے

○

فصلِ گُل ہے، آ، لبوں پر رقص کر، اے زہرخند
ورنہ ہم پر تہمتِ آزردگی لگ جائے گی

اَوجِ معیارِ سخن کا ہے یہی عالم تو پھر
رفتہ رفتہ لب پہ مُہرِ خامشی لگ جائے گی

○

سفر دراز' نہ کوئی مکاں' نہ کوئی درخت
کوئی پناہ' نہ بارش کو روکنا بس میں

بھرے جہاں سے الگ ہو کے ہم کلام رہے
مدام میں' مرا سایۂ اُداس' آپس میں

کسے ملے گی لرزتی لووں کی راہبری
کہاں رہی ہیں وہ بام و چراغ کی رسمیں

○

تمام عمر اکیلے میں تجھ سے باتیں کیں
تمام عمر ترے روبرو خموش رہے

تری صدا' تری بوئے قبا کی چاہت میں
ستم کشِ نفس و زیرِ بارِ گوش رہے

○

سحرِ شبِ مہ ٹوٹ گیا چاند کا کنگن
گرنے کو ہے اب ساعدِ سیمینِ سحر سے

دو گام پہ اب ختم ہوئی جاتی ہے دیوار
اب دیکھتے ہیں کون نکلتا ہے اُدھر سے

ہم تجھ سے گریزاں بھی اگر ہیں تو اِسی طور
جس طرح کوئی شاخ گریزاں ہو شجر سے

○

کون غرقاب ہوا ہے مجھے معلوم نہیں
ایک پیراہنِ رنگیں ہے لبِ جُو باقی

گُل بہر رنگ، بہر حال ہے مجبورِ سرشت
دستِ گلچیں میں بھی رہ جاتی ہے خوشبو باقی

○

تم بعدِ مرگ بھی اگر آؤ تو مرحبا
بازو سرِ صلیب کشادہ رکھیں گے ہم

○

زمیں قاہر بھی ہے ظالم بھی ہے اور بے اماں بھی ہے
پرندوں کے جسد بھی خاک میں آسودہ دیکھے ہیں

○

کوئی تیشہ تو چلا کوئی شرارہ تو نکال
مدتیں بیت گئیں سوچ کو پتھرائے ہوئے

○

کچھ بے حسی بھی چاہیے بہرِ سکونِ دل
ہر لرزشِ صبا کے کہے پر نہ جائیے

○

چوما کسی گُل کو نہ کسی خار سے الجھا
بعد اپنے چمن میں مری بیگانہ روی دیکھ

○

ہائے وہ ساعتِ خوں گشتہ کہ تو پیشِ نظر
تھا مگر بہرِ تکلّم کوئی تقریب نہ تھی

○

راستے اور بھی تھے تیری گلی تک لیکن
ہم کو وحشت کے کڑے کوس پسند آئے ہیں

○

نقش و نگارِ بحر کو چشمِ حباب ہو کے دیکھ
آخری بار شہر کو پا بہ رکاب ہو کے دیکھ

○

زمین سخت ہے اور رہبری ہے میرے سپرد
لہو میں پاؤں ڈبو لوں تو نقشِ پا ابھرے

○

نکل گیا تھا سرِ شام کارواں تیرا
تمام شب ترے نقشِ قدم سے بات رہی

○

پھوڑ لیں سر بھی تو دنیا کا معمّا نہ کھلے
جیسے دیوار پہ تصویر ہو دروازے کی

○

اُس ایک نظر سے ہے اب تک کی غزل خوانی
سو رنگ سے بنتی ہیں اک زخم کی تصویریں